

4658

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن منبر ۱۳۲

رسالہ توحید

افادات حضرت سید العلماء مدظلہ

محصول از

قیمت ۲۰

تعارف

”اسلام کا نظریہ حکومت“ کے

موضوع پر سرکار سید العلماء مدظلہ کے دس بیانات جو مدرستہ الوداعین لکھنؤ میں ۱۳۹۶ھ میں ہوئے تھے وہ افسوس ہے کہ شارٹ ہینڈ رپورٹ کے نہ ہونے کی وجہ سے قلمبند نہ ہو سکے تھے مگر چونکہ فی زمانہ ان کی اشاعت کی انتہائی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس لیے ان بیانات کا خلاصہ ہی سر دست شائع کرنے پر اکتفا کی جا رہی ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ اس موضوع پر ایک بسیط کتاب بھی شائع کر دی جائے گی۔ اگرچہ ایک اعتبار سے یہ بھی مکمل ہے کیونکہ اس میں بھی جملہ ضروری اجزاء آگئے ہیں یعنی خاکہ مکمل ہے صرف توضیحات و امثال کی ضرورت ہے۔ اُمید کہ افراد ملت اس رسالہ کی اشاعت کی جانب بھی خاص توجہ فرمائیں گے۔

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والصلاة على سيد الانبياء والمرسلين
والسلام الطاهرين

تمہید

حکومت کی ضرورت سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نوع انسان کے لئے حکومت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق العنان آزادی کا تخیل انسان کے لیے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں مگر انسان کا آزادی مطلق سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اُس کا فطری حق ہے بالکل بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ ”نا جائز قیود سے آزادی“ اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اُس کے لئے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں۔ حالانکہ حیوانات میں بھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مغربی نہیں ان ہی اجتماعی قیود کا نام ”دستور العمل اور قانون“ ہے اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔

ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساس فرض رکھتے ہوں تو ان کے لئے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لئے صرف احساس فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ اُن سب کا نقطہ نظر مفاد اجتماعی میں ایک ہی نقطہ تک پہنچے اور کوئی دانستہ یا نادانستہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے اور یہ اُسی وقت ہو سکے گا جب وہ پوری جماعت فکر و ارادہ و عمل تمام منزلوں میں یکساں درجہ پر غلطی سے بری یعنی معصوم ہو ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پر فراہم ہونا خیالی دنیا میں ممکن ہے وجود رکھتا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بیگانہ ہے اس لئے اس صورت پر بحث ہی کرنا بیکار ہے، جہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا نظام اجتماعی یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے یہ بھی کچھ حدود و حقوق اور ان کی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اُس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت ہے جو سب کو اُن حدود کا پابند بنائے اُسے آپ حاکم نہ کہے گھر کا بڑا کہہ لیجئے۔

نمبر	
۴۵	
۴۶	
۴۷	
۴۸	
۴۹	
۵۰	
۵۱	
۵۲	
۵۳	
۵۴	
۵۵	
۵۶	

۱	
۲	
۳	
۴	
۵	
۶	
۷	

منہ

مگر یہی چیز ایک بڑے دائرے میں پہنچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں چاہے جتنا بھی اختلاف کیا جائے مگر اس کی ضرورت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اقسام حکومت

۱) ایک شخص کی حکومت

(۲) محدود و محدودین افراد کی حکومت

(۳) بہت سے افراد کی حکومت

ادریہ واقعہ ہے کہ اس وقت ہے اب تک وہ ہزار ہا برس گزرنے کے باوجود دنیا طح طرح کے تمدنی انقلابات اور نظریات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں صورتوں کے دائرہ سے باہر نہیں نکلی ہے مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی حکومت اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایک شخص میں آخر امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہو جائے اور باقی سب انسان اس کے محکوم ہوں۔

اس کے لئے قدیم زمانہ میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پیدا کیا گیا کہ حاکم پیدا نشی طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے انسان حیوانوں میں ایک نوع ممتاز ہے ویسے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوع ممتاز ہوتا ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے ان انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی آخر میں مقید رہے ہیں۔ بلکہ گدائی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تصور صرف اس تخیل عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام کے دماغ و دل پر ان کی سلطنت کے دور میں ستولی ہوتی ہے۔ اور اسی لئے جب وہ تخیل ختم ہو جاتا ہے تو وہ بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اگر ان کا امتیاز کوئی پیدا شدہ حق ہوتا تو وہ بھی سلب نہ ہوتا۔ نہ اس میں انقلاب ہوتا۔ پھر جب ہم تاریخ کا تبصرہ مختلف سلاطین پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر موت سے اوصاف میں عام انسانوں سے بھی بہت تھے۔ چونکہ مورخ کا قلم اکثر اس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں بادشاہ کی نسبت ہوتا ہے اس لئے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احسن تھا۔ یا جاہل تھا۔ یا بے رحم تھا۔ یا خود غرض تھا وغیرہ وغیرہ

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتا یا گیا ہے وہ طاقت و طاقت دار ہے اسی کو دوسری لفظوں میں قہر و غلبہ کہا جاسکتا ہے۔ یہیں قہر و غلبہ کا ذریعہ حکومت ہونا تسلیم ہے مگر معیار حقانیت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہو جاتی ہے، بالکل ٹھیک مگر قائم ہونا چاہئے بھی۔ ایسا نہیں ہے۔

بہت سی باتیں ہو چکی ہیں مگر ان کا ہونا صحت و جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا اور گھر واسے بے خبر ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہے کہ چور آئیں اور سب مال سے جائیں مگر ان کا یہ مال و اسباب بچانا جائز بھی ہو یعنی وہ مجرم نہ قرار پائیں ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہو کر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا تعداد میں کم ہوں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاکو جبر و طاقت سے ان کے مکان یا اسباب پر قبضہ کر لیں گے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مال و اسباب یا جائیداد ان کی ملک بھی ہو جائے بلکہ دنیا کا ہر قانون ان کو وہاں کو سزا دے اور ان سے اس مال کے برآمد کرنے کے لئے تیار ہو گا پھر اگر ایک مکان پر قہر و غلبہ ملکیت قائم نہیں کر سکتا تو ایک ملک یا قوم پر یہ قہر و غلبہ تسلیم کو جائز نہ کر سکتا ہے۔

پھر اگر طاقت ہی کے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل کر کے اس کی مخالفت کرے تو اسے کیونکر جرم سمجھا جاسکتا ہے۔

اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لئے دوسرے انسانوں پر کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔

دوسری قسم یعنی چند انسانوں کی حکومت اس کے بارے میں بھی وہی سوال ہے یعنی ان چند آدمیوں کو حق حکومت کیونکر حاصل ہوا۔ اور جس طرح ایک شخص کی حکومت کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکتی اسی طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلا وجہ ہے۔

تیسری قسم یعنی بہت سے آدمیوں کی حکومت اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ بہت سے آدمی تمام قوم کا جز ہیں یا کل قوم ہیں اگر جز ہیں تو پھر وہی بات بحث طلب ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو باقی افراد پر حکومت کا حق کیا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پوری قوم حاکم ہے اور خود ہی محکوم تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفاد حکومت ختم حکومت کی ضرورت تو اس لئے تھی کہ ان افراد میں جو خود غرض مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند بنائے۔ لیکن جبکہ قانون سازی خود اس جماعت کا کام ہو گیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا جس وقت چاہے گی ویسا قانون بنائے گی چاہے وہ صحیح ہو چاہے غلط۔ اور اس کے نتیجہ میں مختلف جماعتوں اور مختلف افراد میں رستہ کشی ہوتی رہے گی۔ یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جامعہ کے سر منڈھ دے۔ اور اس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اس کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہو۔

پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لئے خود مقرر کرے تو جبکہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کئے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہو گا یعنی انھیں یہ لحاظ نہ ہو گا کہ صحیح و مناسب کیا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی بھی انھوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی تو دوسری بار کے انتخاب میں ان کے ہاتھ سے اختیارات لے لیے جائیں گے۔ اور دوسروں کے سپرد کیے جائیں گے۔

پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ ووٹ یعنی انتخابی رائیں مگر یاد رہے کہ عوام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بے سوچے سمجھے خواص کے ہاتھ میں ہو جاتے ہیں اور جو خواص چاہتے ہیں وہ ان سے کرا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افراد قوم پر مسلط کرتے ہیں اور ان کے احکامات بے ہوشی سکھا دیتے ہیں یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبیلہ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت وہی محذول و منکوب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر عوام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا رجحان بھی صحت کا ذمہ دار نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار بھی ایک شخص یا چند اشخاص کو ایک طرح کے قہر و غلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی غلبہ فوجداری ہتھیاروں سے حاصل کیا جائے اور کوئی غلبہ ایسے ہتھیاروں سے جو دماغ و توجہ کو دیں کوئی شکنجہ ایسا ہو جس سے جسم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکنجہ ایسا ہو جو آزادی خیالات کو محصور کر دے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معادہ عمرانی اور اس پر بحث ایک نظریہ جسے "معادہ عمرانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے

اس طرح کہ فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کر دے مفاد اجتماعی کی خاطر۔ اس طرح یہ پابندی اس کے لئے بار خاطر نہ ہوگی کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بخوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہے۔ مگر اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح ابتدا میں یہ معادہ دل کی خوشی سے ہے اور اسی لئے وہ حق آزادی کے خلاف نہیں، اسی طرح کیا بعد میں اس معادہ پر باقی رہنا امر اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معادہ کیا تھا خود ہی اس معادہ کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے اور اگر خلاف ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معادہ پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لئے سلب ہو گئی حالانکہ اس نظریہ کی بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔ پھر یہ کہ جب افراد جامعہ خود غرض اور مطلب پرست ہوں تو انھیں اس کا پابند کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفاد شخصی کو پیش نظر نہ رکھیں اور صرف مفاد اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے جو قانون بنے وہ مفاد عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دنیا نے جتنی بھی حکومت کی شکلیں تجویز کیں ان میں سے کوئی بھی کسی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومتیں اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر آخر اسلام کا نظریہ حکومت کیا ہے؟ یہاں پر بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریہ حکومت یعنی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کا نظام۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ شہور ہے کہ وہ جمہوری اصول پر نہیں مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان تمام حکومتوں میں شخصی فرمانروائی تھی جس کا اصول بھی ایک تھا بلکہ بھی ایک جلسہ میں حاکم کا انتخاب ہوا اور بھی سابق کے حاکم نے اپنے بعد واسے کو نامزد کر دیا اور کبھی اُس نے ایک کیلٹی شہرہ کے لئے بنادیا اور کبھی اُنھیں صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا جیسا ہوتا گیا دیکھتے ہی اصول بننے لگے یعنی جامع اختلاف۔ شوری۔ قہر و غلبہ

اب شہر طور پر ان چاروں اصول پر تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
اجتماع اس سے مراد تمام رقبہ مملکت کے افراد کا اتفاق سے یا صرف دارالسلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا دہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہو گئی ہو یا ان میں سے بھی بعض کا جو متفق ہو گئے ہوں۔

اگر کل افراد عدد و مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانہ برق و بخار میں زمانہ سیارہ و طیارہ میں بھی ممکنوں کا کام ہے جبہ جائید کہ اُس زمانہ میں جبکہ یہ وسائل مختار نہ تھے، اُس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائے کہ اس سے کم یعنی ایک دن کا تھوڑا سا حصہ۔

پھر عقلی طور پر وہ کہتے ہی کثیر افراد ہوں ان میں سے سب کے فیصلہ کا درست ہونا بھی اس پر یقین ہے کہ اُس میں کوئی ایک غیر جائز اختصار یعنی مصدوم مانا جائے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی کی آماجگاہ ہر وہ کل غلطی سے بری کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اور اگر صرف دارالسلطنت کے کل افراد تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ باقی اطراف مملکت کے افراد کی آزادی کو سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر مسلط کر دیں اس طرح کہ انھیں چون دیر کا کوئی حق نہیں۔ اور اس سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ دارالسلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کشمکش و اختلاف کے ساتھ جس میں اتھاپائی تک کی نوبت آئے۔ پھر جبکہ یہ اجراع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا ہوا اور اس کے لئے لوگوں کو سوجنے کا بھی موقع بالکل نہ دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جاسکتا ہے نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبر کی حدیث۔ آیت یہ ہے کہ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ لہدیٰ ویقع غیر سبیل امور متین نول، ما نولی وفضلہ جہد و ساء تا مصیرا اس میں صرف لئے فقرہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ جہنمی ہے مگر مومنین پر تو اللہ لام استغراق ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلا کہ جتنے بھی مومنین ہیں جس جگہ جمع ہو کر کوئی فیصلہ کر لیں وہ صحیح ہوگا۔ پھر یہ پوری آیت کا مضمون ہے بھی نہیں پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسول سے جھگڑا کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے یہ جہنم میں جائے گا اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول سے جھگڑ کرنا خود مومنین کے راستے کے خلاف ہے اور تقاضا نامے ایمان کے خلاف ہے۔ اس سے تو نتیجہ اور خلاف نکلتا ہے یعنی یہ کہ پیغمبر کے مقابلہ میں امت کو ملنے والی کا حق نہیں ہے۔

حدیث کا نتیجہ امر امتی علی ضلال (یا) علی خطاء یعنی پیغمبر کا ارشاد ہے کہ میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیث سند کے اعتبار سے بالکل درست ہوں تب بھی اس میں تمام امت کے اجتماع کا ذکر ہے۔

چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز نہ کوئی نہیں ہے معلوم ہوا کہ اجراع جس معنی سے معیار حکومت قرار دیا گیا ہے اُس کی صحت پر کوئی دلیل عقلی یا نقلی نہیں ہے۔ یہ کہ گیا اختلافات تو ظاہر ہے کہ اُس کی بنیاد ہے اُس حکمران کے حق حکومت پر جو دنیا سے جدا ہے اور جبکہ اُس کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو اختلافات کا کیا حق اس سے قائم ہوگا۔

اس کے بعد شوری وہ ساختہ و پرداختہ اُس حاکم کا ہے جو باستقلال عین ہوا تھا اور جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کی نامزدگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے عمل پر ثابت نہیں تھی چوتھی چیز قہر و غلبہ یہ وہی طاقت حق والا نظریہ ہے جس کو اپنے غلط ثابت کیا جا چکا ہو پھر اگر قہر و غلبہ ہی معیار صحت ہے تو اس میں اسلام کی بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ کہوں نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں تمام غیر اسلامی حکومتیں شرعی اور جائز حکومتیں ہیں اس لئے کہ ان میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی تنہا غلبہ و

اقتدار کو وجہ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کار سے اتنا شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا دشمنہ زیر آستین پہناں کیے ہوئے کا فیر یعنی منافق اب دوبارہ پھر بحث آتی ہے کہ خود اسلام کا نظریہ حکومت کیا ہے؟

اسلام کا نظریہ حکومت

یہ پہلے بیان ہو چکا کہ حکومت کے دو کام ہیں ایک دستور و قانون کی تشکیل۔ دوسرے طاقت و اقتدار کے ساتھ اس نظام کا اجراء و نفاذ۔ اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر "اسلام" نام ہوتا صرف کچھ عقائد کا جو داغ میں جگہ پالیں اور انھیں عمل سے تعلق نہ ہو یا کم از کم عمل سے تعلق ہوتا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اُسے اجتماعیات سے بحث نہ ہوتی تو بے شک یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود کرنے کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کر لیں لیکن اسلام تو خود ایک دستور حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں بلکہ زندگی کے لیے عملی ضوابط و قواعد ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے متعلق نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مسلمان اسلام کو قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی و اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم رہتے ہوئے۔ پھر خود قانون سازی کرے۔ یا کسی دوسرے شخص کے لئے قانون سازی کے حق کا قائل ہو۔ یا پوری قوم مجتہدہ طور پر قانون سازی کے کام میں شریک ہو۔ یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا جبکہ وہ مسلم ہے اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے کو قانون اسلام کے سپرد کر چکا ہے۔

موجودہ زمانہ کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کو اُس جماعت سے خارج ہونا چاہیے جس کے لئے قانون بن رہا ہے تاکہ وہ قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہو سکے اس لئے زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لئے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا جائے، مگر یہ تو اُس وقت صحیح ہے جبکہ قانون کا دائرہ شریعہ ہی سے ملک یا اقلیم کے لئے ہو لیکن اگر قانون ملکوں اور قوموں کی تفریق سے بالاتر ہو یعنی تمام نوع انسانی کے لئے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون ساز نوع انسانی کی جماعت سے خارج ایک بلند ذات ہو یعنی خالق عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے۔ یہی اسلام کا نظریہ حکومت ہے۔

یہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے۔ ایک مسلم اسلام کے ساتھ ہی اُس کی اور صرف اُس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد کسی فرد کسی مجلس یا کسی قوم کا حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے اور اس کے بعد اسطو کی تینوں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب ایک حاکم حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط چند آدمیوں کی بھی حکومت غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔

اس کا نتیجہ ہے آزادی کامل یعنی انسان کی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا یا ایوں کہوں کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دباؤ فطرت کے قیود سے باہر ہے۔ رہ گیا خالق اُس کی اطاعت فطری طور پر بہر حال کرنا ہی ہے۔

اگر ارادی افعال میں بخوشی نہ کرے گا تو اضطراری اور فطری افعال میں بکسر کرے ہی گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ لہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً و کرہاً مگر انسان کا اثر انسانی اس کا مقنی ہے کہ وہ اس اطاعت کو با اختیار کرے تاکہ اُس کی حق شناسی کا ثبوت ملے۔ بے شک چونکہ اُس کے قانون کے معلوم کرنے کے لئے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہنچ کر ہم سے بات کرے اس لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے یہ رسول ہے مگر اس کا کام احکام الہی کا پوچھنا ہے۔

نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے اور نہ اُس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اُس کی زبان پر آتے ہیں وہ احکام الہی ہیں۔

(وما یذوق عن الہوی ان ہوا الا وحی یوحی) اور جو اس کی اطاعت ہے وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے (ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ) اب جبکہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے حق حکومت میں مداخلت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایان شان نہیں ہے۔

قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ وما کان لمومن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یقولن لہم الخیرۃ من امرہم کسی مومن یا مومنہ کو امر اور رسول کے حکم کے سامنے اپنے معاملات کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا۔

دوسری جگہ زیادہ واضح کلیہ کی شکل میں اعلان کیا ہے وریک یخلق ما یشاء و یمار ما کان لہم الخیرۃ پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے

نمبر	
۴۵	
۴۶	
۴۷	
۴۸	
۴۹	
۵۰	
۵۱	
۵۲	
۵۳	
۵۴	
۵۵	
۵۶	

۱	
۲	
۳	
۴	
۵	
۶	
۷	

انھیں انتخاب کا حق نہیں ہے۔
 اس کے علاوہ سنت اُمیہ جو قرآن مجید کے تتبع سے ظاہر ہوتی ہے، وہ یہی ہے۔ یہاں تک
 کہ اس کی طرف کا حکم خود بخود اپنے لیے اس کام میں اندر گار بھی خود اپنی طرف سے مقرر نہیں
 کرتا بلکہ اللہ کے (عاکر تبارے رائے) کہ فی امری اور محدود و مقصور یعنی دشمن کے مقابلہ کیلئے
 ایک سردار بھی جو نبی یا رسول نہیں بلکہ ملک کے نام سے تعین کیا گیا ہے وہ بھی قوم خود مقرر
 کر سکتی، بلکہ نبی سے خواہش کی ابتداء انہ لگا نفاذ فی سبیل اللہ اور نبی نے بھی خود مقرر
 کیا بلکہ یہ کہ ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکاً اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر
 کیا ہے۔ پھر قوم نے اس کے امتحان پر اعتراض کیا وہ اعتراض اور قوم کا حق و راجح بھی قبول
 نہ کیا گیا بلکہ اس ذیل میں ایک کلیہ کا اعلان کر دیا گیا کہ واللہ یوفی مملکت من یشاء۔ اللہ
 اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حاکم حقیقی اللہ ہے تو اللہ ہی نائب کو
 مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب انسانی جماعت میں ہمارا اصلی رہنما بن سکتا ہے۔
 مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے سلب کر کے اپنے ذمہ لے کر بڑا نقصان
 اٹھایا یا بس معنی کہ اگر وہ اصول مقرر رہتا تو پھر وہ من و تو کا سوال پیدا ہو کر انتشار نہ پیدا کرتا۔
 دیکھ لیجئے کہ رسول کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا پھر ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دو رسول
 ہو جاتے۔ قبلہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قبلے ہو جاتے اور کتاب کو اللہ
 کی جانب سے مانا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قرآن ہو جاتے۔ اختلاف اس اُسی وقت سے پیدا ہوا
 جب سے حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بس اس کے بعد سے جو
 مسلمانوں کے شیرازہ میں انتشار پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔
 پیغمبر کا اعلان و عمل دونوں اس بارے میں متحد رہے کہ حاکم کے انفرادی رعا کا دخل
 نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے بعد حکومت
 میں میرا حصہ قرار دے دیکھتے تو حضرت نے جواب میں صاف فرمادیا کہ اس کا مجھے اختیار نہیں
 یہ تو اللہ سے متعلق ہے۔ اب جو حضرت نے بیعت عشرہ میں حضرت علی ابن ابیطالب کے اہل
 میں اعلان کیا کہ یہ میرا زیر و وحی اور خلیفہ ہے تو بحیثیت مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرت
 کا اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر اعلان نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف کا اعلان ہے۔ اور اس اعلان
 سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے۔ ورنہ رسول اس کو

اپنے ذمہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبہ میں پیغمبر نے ولایت علی کے اعلان کے قبل پہلے مسلمانوں سے رسول
 تسلیم کر لیا اس استغفار کے ساتھ کہ اللہ اولیٰ بکم من انفسکم قالوا بلیٰ کیا میں تم سے زیادہ
 اختیار نہیں رکھتا ہوں سب نے کہا بیشک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں۔ اب اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو
 مسلمانوں کو اپنے خود مختاری کے حق کا حکومت کے بارے میں دعویٰ بھی صحیح قرار ہی نہیں پاسکتا۔ اور
 اسی لئے رسول کی زندگی میں یہ صدا کسی دہن سے بھی نکلتے نہیں سنائی دیتی کہ حکومت ہمارا حق ہے
 یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے۔ ان رسول جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب اجماع اور خودی اور قہر
 و غلبہ کا نام بھی سنائی دینے لگا۔ مگر یہ مسلمانوں کے خود ساختہ اصول ہیں۔ ان کا اسلام سے
 قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔
 ظاہر تک حکومت کے یہ اصول جمہور مسلمین میں تسلیم کیے جاتے رہے۔ اور عام نظریہ یہی
 قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہو جائے تو
 کسی کو مخالفت کا حق نہیں اور اگر کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تاویسی مہم جاری
 کرے۔ تو حاکم کا فعل درست اور جو شخص اُس کے خلاف ہو وہ مجرم اور اگر اس سلسلہ میں
 قتل ہو جائے تو گمراہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا۔ شہید اُسے نہیں کہا جاسکتا۔
 یہی اب تک عمل درآمد رہا تھا جس کے شواہد تاریخ میں بہت ہیں امیر شام معاویہ نے
 اپنے فرزند یزید کے لئے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک بلکہ ان تمام طریقوں کو
 جمع کر دیا۔ انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں خود جا کر جلسے کیے اور یزید
 کی بیعت لی۔ اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی خلافت پر ہوا ایسا اس کے پہلے کسی خلیفہ
 پر بھی نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اختلاف بھی تھا اور قہر و غلبہ بھی اس کا نتیجہ صاف ہے
 کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا چاہیے۔ اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اُس کے خلاف
 ہر کارروائی کا حق اور وہ اگر قتل ہو جائے تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔
 محمد حنیف ابن علی کا یہ کارنامہ تھا کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اس بادشاہ کے مقابلہ
 کیلئے اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا زبردست بنادیا کہ
 دنیا حسین کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہوئی۔ حسین اور ان کے ساتھی سب شہید
 تسلیم کیے گئے اور یزید ہمیشہ کے لئے مردود ملعون قرار دیا گیا اس طرح حسین نے اُس
 ظالم حکومت کا تختہ الٹ دیا جو اسلامی نظریہ کے خلاف مسلمانوں میں غلط طور پر مان لیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا نظریہ حکومت مادی اسباب یعنی عوام کے اتفاق برائے انتخاب یا حصول تاج و تخت کا محتاج ہے مگر اسلامی نظریہ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو مخالفت پر کمر بستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو گوشہ نشینی و کس مہر سی ہوا پیوند دار لباس اور فرش حصیر پر لیکن اگر وہ اسلامی قانون کا سب سے بڑا واقف کار اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ "الہی حاکم ہے" اور دنیا پر اس کی اطاعت فرض ہے اور جو حکومت الہیہ کے ماننے والے ہیں وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے اور جو بھی دنیا کا حاکم اپنے مادی اقتدار کی بنا پر تسلط قائم کرے گا اسے ہمیشہ غاصب سمجھیں گے چاہے وہ حکمران ظاہری طور پر اپنے کو مسلمان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اُس فرقہ کا پیر و جانا ہو جس میں حکومت الہیہ کے نظام کو تسلیم کیا جاتا ہے یا درکھنا چاہیے کہ حکومت الہیہ کا ایک پیر و کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہو سکتا یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظام اقتدار کے شکنجہ میں اسیر بھی ہوگا تو ہمیشہ اس پر نظر رکھے گا کہ اللہ کا حکم اُس کی نسبت کیا ہے اگر اُس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظت جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ کی خاطر حکم الہی ہی ہے کہ ہمیں خاموشی کے ساتھ قانون سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل کرے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومت وقت کے احکام کی اطاعت ہے مگر حقیقت میں اپنے حاکم اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے نتیجہ اُس کا حاکم وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہو گیا ہے لیکن اگر وہ اپنے حاکم اللہ کا یہ اشارہ دیکھ لے گا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ جان دینا گوارا کرے گا گھر کا برباد ہونا قبول کرے گا مگر جہاد کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی روح کبھی غلام نہیں بنائی جاسکتی۔

حکومت الہیہ کے قیام کی دشواری

یہ تو حکومت الہیہ کی اصل حقیقت ہے جو ہر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی کار فرما ہے لیکن جہاں تک اُس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے وہ افراد صالح وجود پر موقوف ہے۔ اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوں تو وہ نائب حکومت موجود ہوگا جسے خصوصیت کے ساتھ بذریعہ منبر نامزد کیا گیا اور پھر بھی دنیا کی حکومت کے

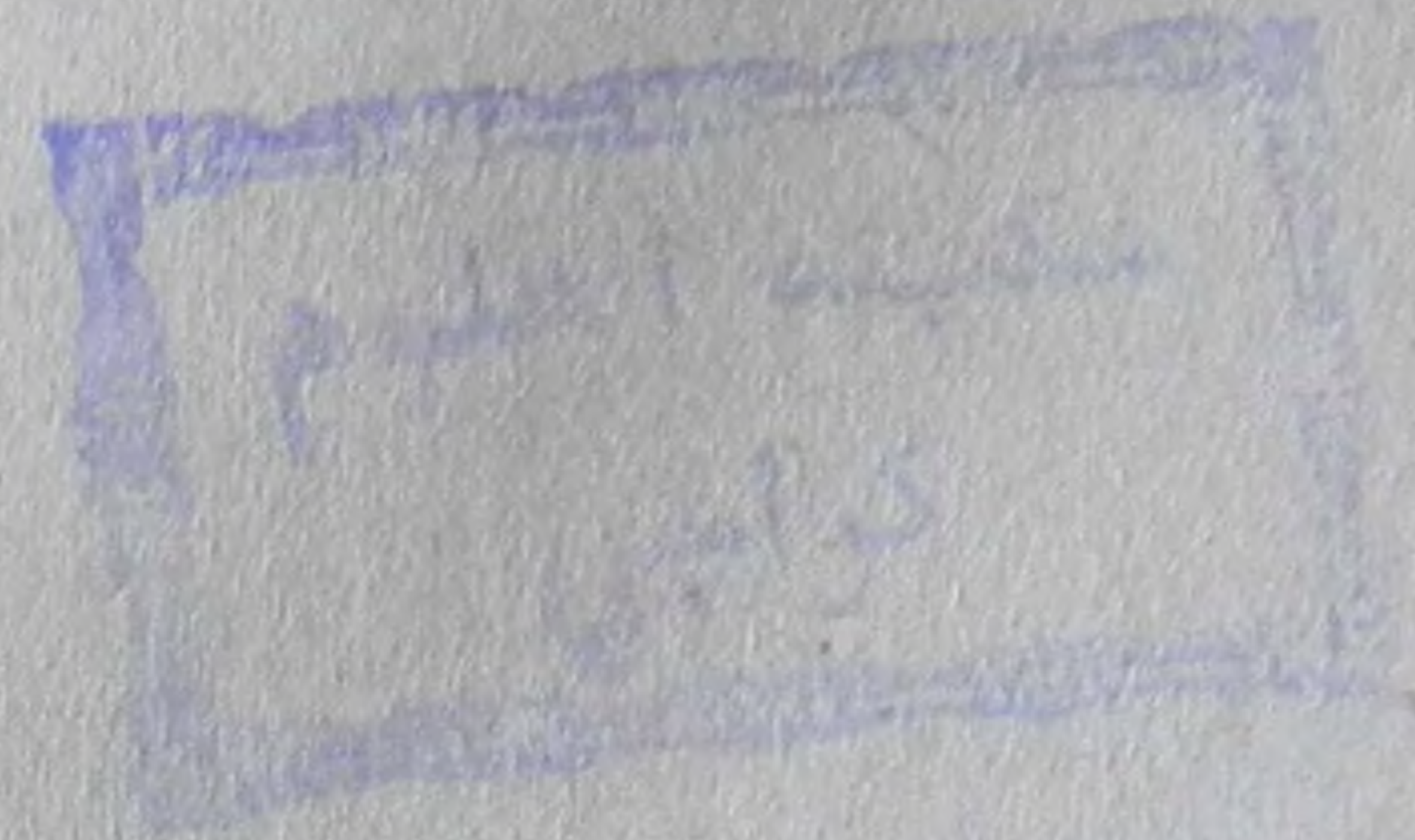
تسلیم نہ کرے گی اور اُسے گوشہ نشین ہو جانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶ برس تک جاری رہے گا جو اس کے تجربہ کے لیے کافی ہے کہ افراد صالحہ کا فقدان حکومت الہیہ کے ظاہری طور پر برسر اقتدار آنے میں مانع ہے لہذا اگر اس کے بعد نائب خاص ہماری نگاہ سے ادبھل ہو جائے تو اس کا سبب افراد کی عدم صلاحیت ہی قرار پائے گی۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جب حکمران غائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو۔ یقیناً اگر اس وقت افراد صالحہ پیدا ہو جائیں تو حاکم حقیقی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کر دے۔

جبکہ ایسا نہیں ہے تو موجودہ حالات میں حکومت الہیہ کے برسر اقتدار آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

یوں نظری حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت یہ حق حکام شرع یعنی علمائے دین کا ہے مگر موجودہ مادی رجحانات کی رو میں ہیں یقیناً ہے کہ اگر اس طرح کی تشکیل کا ارادہ کیا جائے تو خود اُس طبقہ میں جو منصب حکومت کا اہل سمجھا جائے بہت سے افراد برسر اقتدار آنے کی کوشش کریں گے جو شاید اس کے اہل نہ ہوں اور ان افراد کو گوشہ نشین رہنا پڑے گا جو اس کے واقف اہل قرار پاسکتے ہوں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نتیجہ میں وہ حکومت بھی حکومت الہیہ نہ ہوگی چاہے وہ حکومت شرع کے نام سے قائم کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ افراد صالحہ ہمارے علم میں نایاب ہیں اور ہوں تو یقیناً گوشہ ہائے گمنامی میں ہیں جن کا تقارن بھی دنیا کو نہیں ہے ایسی صورت میں یہ یقیناً سمجھنا چاہیے کہ جو بھی حکومت قائم ہوگی وہ "غیر الہیہ" ہی ہوگی۔ چاہے وہ غیر دین کی ہو اور چاہے اپنوں کی ہو لیکن حکومت الہیہ کے علاوہ کسی اقتدار کی تنظیم اور کسی ادارہ سے غیر مشروط معاہدہ تعاون یا بیعت کسی طرح جائز نہیں جبکہ اللہ کے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہو ہے کہ ہیں اُس کے احکام پر عمل کرنا ہے تو کسی جماعت کے نظام عمل کو ہم غیر مقید طریقہ پر کیسے قبول کر سکتے ہیں جبکہ یہ ممکن ہے کہ اُس نظام عمل میں ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ ہمیں حکومت الہیہ کے احکام کی تعمیل میں اُس کی مخالفت لازم ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ہر حکومت کے ساتھ امن عام کی خاطر تعاون کرنا لازم ہے مگر اگر وہ کہہ کر یعنی خود اپنے فرض کے احساس سے صحیح طریقہ عمل کو معلوم کرے۔

۱۶
لیکن کسی جماعت کے طریقہ کا پابند ہو کر عمل کرنا یہ حکومت اکتیہ کی پابندی کے
منافی اور ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے۔ والسلام

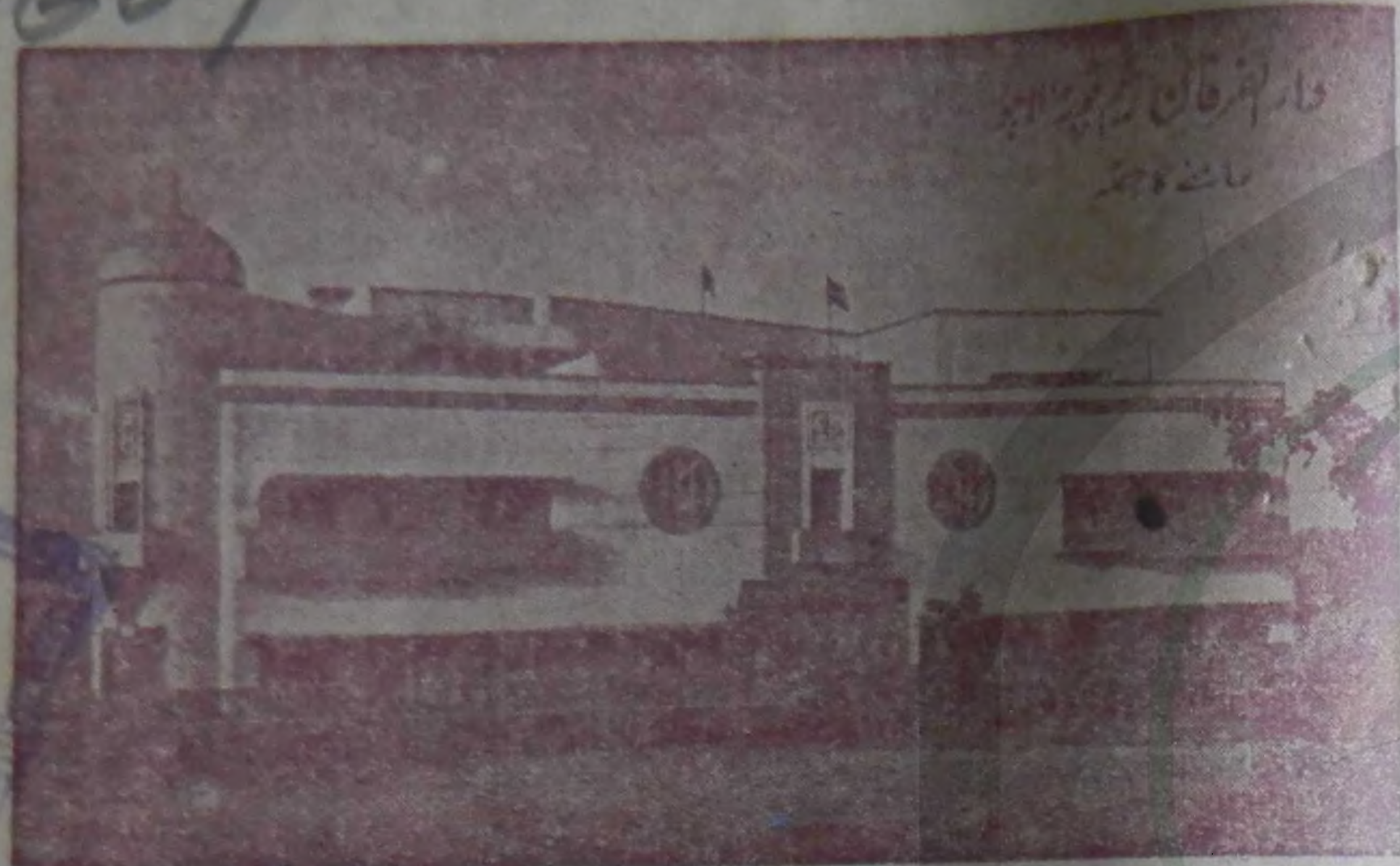


پبلشر
سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری
اماسیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
منیر از قومی پریس لکھنؤ

اہم ترین فرقہ انگیزی
بیگم پورہ لاہور

4609



منی آرڈر مینجمنٹ کاپی

علامہ فیضان الدین احمد انجمنی (بانی) دارالافتاء حیدرآباد
بیگم پورہ لاہور

maablib.org

قبلہ